آمنہ بی بی
پی ایچ ڈی سکالر، (اردو)
وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد
ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ
پرنسپل، سٹائم فاؤنڈیشن ڈگری کالج، گجرات

انور مسعود کی شاعری میں طنز و مزاح کا المیاتی پہلو

Name of Anwar Masood needs no introduction for satire and humor in Urdu language. His creations in humorous and satirical work both in prose and in poems are a great asset of Art and literature. "GHAZLIAT" and poems written during emergent circumstances, on national and international affairs about political and of society, apparently seen diving deep in the sea of laughter but actually when the reader pauses and contemplates, he marvels at the depiction of bleak sorrows and dismal distresses of human life. Every word of his poetry reveals some sufferings of society, which is penned so artistically that brevity and eloquence create an impression of a great writer who is dipping his pen in sacrificing the stream of his heart. Anwar Masood is commonly cold man of street man. He saws his novels and simple thoughts so dexterously. His work always be considered in the top most rank of satirical and humorous poets. His publications are valuable treasure of Urdu literature.

''ہر عہد میں ایک ادیب یا شاعر ایسا ضرور موجود ہوتا ہے جو اپنے وقت کے بقیہ ادیبوں یا شاعروں کو کھا جاتا ہے۔''
یہ بات گو کہ انور مسعود نے غالب، اقبال اور اکبر الہ آبادی کے لیے کہی تھی لیکن حرف بہ حرف سچ خود انور مسعود کے لیے بھی ہوگئی۔ انور مسعود پاکستانی طنزیہ مزاحیہ اردو شاعری اور پنجابی طنزیہ مزاحیہ شاعری کا ایسا درخشاں ستارہ ہیں جن کی جھلملاہٹ میں عصرِ حاضر کے دیگر تمام شعرا کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔

طنز و مزاح اردو ادب کی مقبول صنف ہے جس میں لکھنے والا ادیب یا شاعر اپنے عہد کے معاشرتی، سماجی، سیاسی اور معاشی معاملات و حالات و واقعات کو ذاتی اور اجتماعی نظریات، تجربات و مشاہدات کی روشنی میں طنز و مزاح کے پردوں میں بیان کرتا ہے تاکہ اصل صورت یا واقعہ افرادِ معاشرہ پر گراں نہ گزرے اور زندگی کے تلخ حقائق اُن کے دل کو آزردہ و شکستہ نہ کریں۔ المیہ الم سے ماخوذ ہے اس سے مراد وہ دکھ و الم ہیں جن کا سامنا ہر انسان کو زندگی میں کبھی کسی ضرورت کی عدم دستیابی، کسی خواہش کی عدم تکمیل یا کسی جذبے کی شکستگی کی صورت میں کرنا پڑتا ہے۔ ضروریات زندگی کا دسترس میں نہ ہونا اور خواہشات کا حسرت کی شکل اختیار کر لینا فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں المیے کو جنم دیتا ہے۔ چلبلے فقروں اور شوخ و چنچل قہقہوں میں زندگی کے تلخ حقائق کا بیان ہی طنزیہ و مزاحیہ فن پارے کی اہم خوبی ہے۔ طنز و مزاح نگار کا اہم

منصب معاشرے کی اصلاح ہے۔ایک اعلیٰ طنز ومزاح نگار ہنسی ہنسی میں افراد معاشرے کو نہ صرف ان بنیادی کمزوریوں ، برائیوں اور کج ادائیوں سے آگاہ کرتا ہے جو ان کے لیے انفرادی واجتماعی ، سماجی و معاشی اور خانگی دکھوں اور المیوں کا باعث بنتے ہیں بلکہ اصلاح یعنی طریقۂ علاج بھی تجویز کرتا ہے، یہی خوبی انور مسعود کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں بدرجہء اتم موجود ہے۔زندگی کے تلخ والمیاتی حقائق کو طنز ومزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر کھلکھلاتی مسکراہٹوں میں بیان کرنا یقیناً انور مسعود کی فنی وفکری اُپج کا منہ بولتا ہے، لکھتے ہیں:

شیرینی مزاح میں اُس کو لپیٹ کر
انور نے طنز کو بھی گوارا بنا دیا[۱]

آپ کی پیدائش پاکستان بننے سے تقریباً ۱۲سال پہلے کی ہے۔بارہ سالہ بچے نے پاکستان بنتے دیکھا تو یقیناً ذہن و دل اتنا پختہ تو ہوا ہوگا کہ پاکستان بننے کے خواب کی شدت وحدت کو اپنے بزرگوں اور بڑوں کی باتوں میں محسوس کرسکتا ہو، اپنے بزرگوں کی آنکھوں میں کھلنے والے خوابوں کے کچھ دریچے تو انور مسعود کے وہم وگماں میں کھلتے ہوں گے۔اسی شتابی و بے تابی کے ساتھ آپ نے بڑوں کے ساتھ ''ارض پاک ، پاکستان'' میں قدم رکھا۔آزاد وطن کی فضاؤں میں آپ کے دل و دماغ میں بھی اُمید، جوش اور حوصلے کے دیے روشن ہوئے تو آپ کے رُوز وشب اس خوابوں کی دھرتی ،آزادی کی بہشت ، امیدوں کی جنت ''پاکستان'' میں ترقی کے امید وبیم میں گزرنے لگے۔نومولود وطن میں جہاں تمام ہم وطنوں کو انتہائی سخت انفرادی، سماجی اور معاشی مصائب ومسائل سے گزرنا پڑا وہیں انور مسعود کے بھی اپنی جوانی کے حسین ترین ایام فکرِ روزگار میں بسر ہوئے لیکن ہمت اور حوصلہ سے کام لے کر؛ حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے آپ نے نہ صرف تعلیم مکمل کی بلکہ عملی میدان میں بھی خود کو باروزگار اور مستحکم کیا۔ایک سچا، ہمدرد اور حساس دل ہمیشہ اپنی ذات پر دوسروں کو فوقیت دیتا ہے یہی خوبی انور مسعود میں بھی تھی ،لہٰذا جب انسان اور انسانیت سے محبت کے پرچار اور اپنے احساسات و جذبات اور مشاہدات وتجربات کے اظہار کے لیے شعر وسخن کو وسیلہ بنایا تو شعر پڑھنے کے متبسم اور منفرد انداز واداسے جلد ہی عوام الناس میں مقبولیت حاصل کر لی ۔طنز ومزاح میں چھپے المیاتی حقائق کے ہمدردانہ اور مصلحانہ بیان نے آپ کو اردو شعر وادب میں ایک ممتاز اور بلند مقام پر فائز کر دیا ہے۔ہر سامع اسے اپنے دل کی آواز اور ہر حاضر اسے اپنی روداد جانتا ہے، انور مسعود خود آگہی کے تمام مراحل سے گزر چکے ہیں:

کھل کے رونے کی فرصت پھر اس کو مل نہ سکی
آج پھر انور ہنسے گا بے تحاشا، دیکھنا[۲]

انور کی سرِ بزمِ سخن آئی ہے باری
کیا جانیے یہ شخص ہنسا دے کہ رلا دے[۳]

اب تک آپ کے اردو اور پنجابی کلام کے بہت سے مجموعے چھپ کر قبولیت عامہ حاصل کر چکے ہیں۔جن میں ''شاخِ تبسم''، ''قطعہ کلامی''، ''غنچہ پھر لگا کھلنے''، ''میلی میلی دھوپ''، ''اک دریچہ، اک چراغ''، ''ہن کی کریئے'' اور ''درپیش'' شامل ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی حکومت اور معاشرت میں انگریز راج کے عملی اقتدار کے ساتھ ہی ہندوستانی تہذیب وتمدن اور عقائد و روایات میں تبدیلی اور نئی تہذیب کی آہٹ جو دھیمے دھیمے سنی جا رہی تھی، اب بھاری بھرکم آوازوں میں بدل چکی ہے پرانی تہذیب کو دیکھنے اور برتنے والے چند نفوس ہی اب باقی ہیں۔انور مسعود کا شمار بھی اُنھیں چند نادرو نایاب ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے آزادی کے خوش رنگ خواب دیکھے جن کے حصول کے لیے انھوں نے اور ان کے بزرگوں نے آگ و خون کے سمندر کو پار کیا۔انور مسعود کی شاعری کا ایک حصہ انھیں پرانی باتوں اور آخری یادوں پر مشتمل ہے۔ انور مسعود انھیں چند خوابوں کے امین ہیں جو ان کے بزرگوں نے دیکھے تھے اس لیے ان کی شاعری میں قدامت اور ماضی پرستی ملتی ہے۔اپنی تہذیب وتمدن اور معاشرت سے گہری محبت ملتی ہے۔انھیں اپنی تہذیب کے ان گم گشتہ اوراق کی تلاش ہے، جو نئی تہذیب کی چکا چوند میں کہیں گم ہوتے جا رہے ہیں۔

انور مسعود جیسا حساس دل جو ارض پاک کی دھوپ چھاؤں کو دل سے لگا کر زندہ ہو اور جس نے اپنے ہم وطنوں سے خوب پیار کیا ہو یقیناً ان کی شاعری میں کھلکھلاتے قہقہے صرف اپنوں کی خوشیوں کے ہی نہیں بلکہ تہہ میں چھپے ان کے غموں اور دکھوں کے بھی غماز ہیں۔خود انور مسعود کو بھی اپنے مزاح میں آنسوؤں کی نمی کا احساس تھا اسی لیے اپنے قہقہوں کو بارہا آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے قہقہوں کا نام دیا ہے۔

دیکھ سب کے قہقہے اشکوں میں ہیں بھیگے ہوئے
دیکھ انور بزم میں ایسے نہ تو اشعار پڑھ[۴]

انور مسعود کے اسی جذبۂ احساس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم انصاری لکھتے ہیں:

> انھوں نے اس خیال کو بہت فروغ دیا ہے کہ ہنسی اور قہقہے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ہوتے ہیں۔انور مسعود ایک طناز سخن طراز ہے جو اپنی معاشرتی صورتحال سے ہر طرح جڑا ہوا ہے۔[۵]

انور مسعود کی شاعری مٹی سے محبت کی شاعری ہے، گھر اور گھروندے کی شاعری ہے۔ان گھروں کے باسیوں کے دکھوں اور مسائل کے پنڈورہ باکس سے اٹدتے، گھٹے گھٹے قہقہوں میں آنسوؤں کی شاعری ہے۔

بڑے نمناک سے ہوتے ہیں انور تیرے قہقہے
کوئی دیوارِ گریہ ہے ترے اشعار کے پیچھے[۶]

انور مسعود نے شاعری کی اکثر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان میں قطعہ، غزل، نظم، ماہیئے، رباعی، تحریف، نظم وغیرہ شامل ہیں لیکن اظہارِ خیال و بیان کے لیے قطعہ نگاری کو آپ نے بطورِ خاص پسند اور منتخب کیا اور قطعہ گوئی پر مشتمل

کتاب ''قطعہ کلامی'' کے نام سے شائع ہو کر مشہور ہو چکی ہے۔قطعہ میں بات زیادہ موثر انداز میں کی جاسکتی ہے لہٰذا اس سے پہلے بھی طنز و مزاح کے پیشواؤں اور پیروکاروں نے قطعہ کو ہی پسندیدہ قرار دے کر اس میں فن کے خوب جوہر دکھلائے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی ان کے قطعات کی بابت لکھتے ہیں:

ان کے قطعات کے پہلے تین مصرعے انھیں کی طرح بظاہر بالکل گھریلو اور بے ضرر سے نظر آتے ہیں لیکن چوتھے چلبلے مصرعے میں اچانک ان کی آنکھوں کی ساری شوخی معصوم شرارت پر اتر آتی ہے۔ بڑی سے بڑی اور گھمبیر سے گھمبیر بات کو ایسے ہلکے پھلکے اور دھیمے لہجے میں کہنے کا ہنر جانتے ہیں کہ سننے والا پہلے مسکراتا ہے پھر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔[۷]

انور مسعود زماں کے نوحے، مکاں کے مرثیے واہ سے آہ تک کا سفر ''قطعہ'' کی چار سطروں میں ہی طے کر لیتے ہیں۔ طنز و مزاح کا مقصد و منصب بھی یہی ہے کہ لفظوں کے چٹخاروں کا مزا بھی لیا جائے اور تلخ المیاتی حقائق سے سبق بھی حاصل ہو جائے۔طنز و مزاح کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' میں لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور زندگی کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتا ہے کسی دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی پھیکی اور بدمزہ زندگیوں کو منور کرتا ہے اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے فی الواقع افادیت کے نقطہ نظر سے دونوں ہمارے رفیق و غم گسار ہیں۔[۸]

انور مسعود نے سماج اور زندگی کے رستے ہوئے زخموں کی طرف مایوسی، قنوطیت اور نا اُمیدی سے توجہ نہیں دلائی بلکہ شوخ لفظوں، شرارتی فقروں اور گدگداتے جملوں سے لبوں کو ہنساتے ہوئے اذہان کو متفکر کیا ہے۔آپ کے ہاں عوامی و سماجی موضوعات کی بہار ہے جو ندرت خیال میں بندھے جوق در جوق نت نئے اور رنگ برنگے مضامین کی صورت چلے آتے ہیں ساتھ ہی آپ کے طنز و مزاح میں المیاتی عناصر درجہ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں قہقہہ جتنا بلند ہے؛ دل میں اس کے کرب کا احساس اتنا ہی گہرا ہے۔ایک مزاح نگار کے فرائضِ منصبی میں شائستگی اور رکھ رکھاؤ کا سبھاؤ بھی شامل ہوتے ہیں۔دورانِ مکالمہ ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

میرے نزدیک مزاحیہ شاعری کا اصل سرچشمہ دردمندی ہے، قہقہہ بھی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر کڑھتی ہوئی دلسوزی کا ایک روپ ہے اور ایک صحت مندرویہ ہے۔ایک سچے مزاح نگار کو میں کلی کی طرح سمجھتا ہوں، جلنے لگتی ہے تو کھلکھلا اٹھتی ہے جس شگفتگی میں شائستگی شامل نہ ہو میرے نزدیک کسی اعتبار کی حامل نہیں۔شائستگی کا فقدان ہی مزاح کو ہزل بنا دیتا ہے۔ہجو، تمسخر اور پھکڑ پن وغیرہ ہزل ہی کی مختلف کریہہ صورتیں ہیں۔ایسی شاعری بدمذاقی، بے ہودگی اور سوقیانہ پن کا مظاہرہ ہے اور غیر صحت مندانہ روش ہے، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں نے مزاح کو مذاق سمجھ رکھا ہے حالانکہ اس کے پس منظر میں گھنی سنجیدگی کارفرما ہوتی ہے۔[۹]

انور مسعود آدم سے آدمیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ان کے خیال میں اگر انسان عبرت حاصل کرنا چاہے تو شکستہ و بوسیدہ عمارتوں سے بھی اپنے لیے سبق حاصل کر سکتا ہے لیکن افسوس کہ قوم میں ایسا نہ ہو سکا۔

اجڑا سا وہ نگر کہ ہڑپہ ہے جس کا نام
اس قریۂ شکستہ و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے[۱۰]

انور مسعود نے مزاح کے تمام حربوں سے بخوبی کام لیا ہے ان کی شاعری میں تحریف، مکالماتی مزاح، لفظی بازی گری، تقابل و تضاد، واقعاتی مزاح، کرداری مزاح، محاورات، ضرب الامثال کے استعمال کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ مکالماتی مزاح کے ذریعے آپ نے اپنے جذبات واحساسات کو معاشرے کے کرب میں سمو کر المناک صورت میں پیش کیا ہے۔ عصر حاضر میں بے حسی اور لاپروائی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ قریبی اور سماجی رشتوں میں، رشتوں کو جوڑنے کے لیے دھاگے کا نہیں چبھونے کے لیے سوئیوں کا ہونا انسانوں کا زندہ المیہ بن چکا ہے۔ قریبی رشتے راحت ساماں کم اور تکلیف رساں زیادہ بن چکے ہیں۔ آپ اسی المیے کی ترجمانی ان پرسوز الفاظ میں کرتے ہیں:

اُسے اس وقت فوری طور پر درکار تھا دھاگا
محلے کی دکاں تک اس غرض کے واسطے بھاگا
دکاں والے نے پوچھا آپ کو کیا چاہئے بھائی
طلب کس چیز کی میری دکاں پر آپ کو لائی
کہا آقا مجھے درپیش اک کار مرمت ہے
اور اس کے واسطے رشتے کی ہنگامی ضرورت ہے
اسی کی کھوج میں نکلا ہوں آقا آج میں گھر سے
اگر موجود ہے رشتہ اٹھا لاؤ نا اندر سے
دکاں والا بہت جلد اس کی فرمائش بجا لایا
اٹھا اور اک سوئیوں سے بھرا پیکٹ اٹھا لایا[۱۱]

صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنا انور مسعود کا محبوب عمل ہے۔ واقعات کی تصویر کشی شاعری میں کرنا مشکل فن ہے کہ اصل واقعہ بھی قائم رہے اور مزاحیہ طنزیہ صورت بھی پیدا ہو جائے اس کے لیے گہرے مشاہدے اور فکر وخیال کی بلندی کے علاوہ کثرت ذخیرہ الفاظ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انور مسعود اردو، پنجابی، فارسی اور انگریزی پر عبور رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ذخیرہ الفاظ اور زبان و بیان پر قدرت ان کے جذبات کو فنی وشعری محاسن بخوبی عطا کرتی ہے۔ انور مسعود کے کلام میں مزاح کے حربوں میں تقابل وتضاد کا حربہ بھی نہایت دلچسپ اور خوب صورت انداز میں ملتا ہے۔ اردو زبان کی بے قدری اس تضاد میں ظاہر ہے۔

کہا اس نے اردو مجھے آ گئی ہے
بہت ٹھیک جملے بنائے ہیں میں نے
مجھے ایک پانی کا لقمہ پلا دو
پلاؤ کے دو گھونٹ کھائے ہیں میں نے[۱۲]

''لفظی بازی گری'' مزاح کا ایک آزمودہ و کامیاب حربہ ہے اور اس کو ہمیشہ طنزیہ و مزاحیہ ادب میں پذیرائی ملی ہے۔ انور مسعود کے ہاں بھی سیاسی، سماجی، معاشرتی، اور معاشی بدحالیوں اور تنزلی کو لفظی الٹ پھیر سے مزاح کے پردے میں بیان کیا گیا ہے۔ جمہوری الیکشن کے بارے میں کہتے ہیں:

ووٹوں سے کہ نوٹوں سے کہ لوٹوں سے بنے ہیں
یہ راز ہیں ایسے جنھیں کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
اندر کی جو باتیں ہیں ٹٹولا نہیں کرتے[۱۳]

آج کے معاشی نظام میں جہاں آمدنی سے خرچ زیادہ ہے۔ ضروریاتِ زندگی کے بل ادا کرتے کرتے مہینے بھر کی تنخواہ مہینے کے آخر تک نہیں پہنچتی۔ اس کیفیت کو انور مسعود جیسا دردمند دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ غریب کے دل پر بلوں کی چوٹوں کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلی سے بڑھ کے تھی
ہر ضرب کربناک پہ میں تلملا اٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بل اتنے مل گئے ہیں کہ میں بلبلا اٹھا[۱۴]

آزاد اور پابند نظم دونوں میں انور مسعود کا کلام ان کی تخلیقی قابلیت و اہلیّت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کردہ حقائق معاشرے میں ہونے والی ایسی کج روّیوں کا آئینہ ہیں جن کا سامنا صرف طنز و مزاح کی شبیہ میں ہی کیا جائے تو قابل قبول ہوگا ورنہ ایسا قبیح چہرہ معاشرے کی صورت پر ایک دھبہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں قانونی و عدالتی نظام کی خامیاں انور مسعود نے لیلیٰ کی ماں سے قیس کے لیے بددعاؤں کی صورت بیان کی ہیں۔ نظم میں لیلیٰ کی ماں قیس کو بددعائیں نہیں دیتی بلکہ عدالتی نظام کی حقیقت اور پستی کی قلعی کھولتی ہے۔

میری لیلیٰ کو ورغلاتا ہے
تیرا مردہ، خدا خراب کرے

سوکھ جائے تو بید کی مانند
ترے نصیب نہ ہوں ہرے
تو گرفتار ہو شبے میں کہیں
کوئی ترا اعتبار نہ کرے
تو ڈکیتی میں دھر لیا جائے
دوسروں کے کیے بھی تو ہی بھرے
کسی تھانے میں ہو تری چھترول
تجھ پہ جھپٹیں سپاہیوں کے پرے[۱۵]

طنز ومزاح نگار، طنز ومزاح نگاری سے عمل جراحی کا کام لیتا ہے اور معاشرے کے ناسوروں کو ہنستے کھیلتے زمانے کے سامنے پیش کر کے اصلاح کا مشورہ دیتا ہے، علاج تجویز کرتا ہے تاکہ شدید دُکھ محسوس کیے بغیر بیماری کی سنگینی کا پتہ بتایا جاسکے؛ جس طرح معاشرے کے جسم پر ناسوروں کی کمی نہیں اسی طرح انور مسعود کے ہاں ان کے بیان کے لیے موضوعات کی کمی نہیں۔ وہ ایک ماہر خیاط کی طرح ہر بخیہ کھولتے ہیں۔ معاشرے کو دکھاتے ہیں اور پھر اسے سی دیتے ہیں لیکن اس تکلیف دہ عمل سے پہلے وہ خود گزرتے ہیں پھر معاشرے کو اس درد کا احساس دلاتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی ایک مزاح نگار کے منصب کو ایسے ہی بیان کرتے ہیں ان کے مطابق:

عملِ مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا ہیرا بن جاتا ہے۔[۱۶]

ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ادبا وشعرا فرد کی معاشرتی وسماجی زندگی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ حساس دل اور زیرک لوگ ماحول میں کجیوں اور خامیوں کا ادراک کر کے معاشرے کو نہ صرف سیدھی راہ پر لانے کا کام کرتے ہیں بلکہ معاشرے میں موجود اچھائیوں پر افرادِ معاشرہ کو سراہتے اور ان کی تعریف ودلجوئی کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ ادب وفن پر زندگی کے اثرات کے بارے میں مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

شاعر جو کچھ کہتا ہے اس میں شک نہیں کہ اپنی ایک اندرونی اُپج سے مجبور ہو کر کہتا ہے جو بظاہر انفرادی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ اپج ان تمام خارجی حالات واسباب کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کو مجموعی طور پر تمدن یا ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔ شاعر کی زبان الہامی زبان مانی گئی ہے۔ مگر یہ الہامی زبان درپردہ زمانہ اور ماحول کی زبان ہوتی ہے۔[۱۷]

انور مسعود کا کلام ان کی اندرونی محبت اور بیرونی احساس کا ترجمان ہے۔ انور مسعود عوام کے نمائندے ہیں، عوام کی زبان بولتے ہیں اور خود کو سمجھتے بھی عوامی آدمی ہیں۔ اس لیے عوام کا دکھ اور تکلیفیں ان سے چھپی نہیں ہیں۔ عوام میں رہ کر عوام کا کرب نہ صرف سہتے ہیں بلکہ المناک حقیقت کے بیان سے خود آگاہ بھی ہیں۔ اپنے نظریۂ طنز ومزاح کے المیاتی پہلو

کے بارے میں لکھتے ہیں:

میرے قہقہے نچوڑے جائیں تو ان میں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ میرا حال بادل کا سا ہے جب اس میں بجلی چمک جائے تو مسکراتا ہوا لگتا ہے اور جب برسنے لگے تو روتا ہوا لگتا ہے۔[۱۸]

اپنے اسی اسلوب کو نظم کے پیرائے میں بھی بیان کیا ہے:

تیرا رنگِ مزاح بھی انور
ایک اسلوبِ آہ و زاری ہے[۱۹]

طنز و مزاح معاشرے کے لیے اسی صورت میں قابل قبول ہوتا ہے کہ اس میں اصلاح معاشرہ کا کام دردمندی اور ہمدردی سے ہوتا ہوا محسوس ہو؛ اسی طرح طنز و ظرافت کی تخلیقات میں ایک زیر لب مسکراہٹ کا جاری رہنا بھی کامیاب ظرافت نگاری ہے کہ قاری پڑھتا بھی جائے اور خود کو ہلکا پھلکا بھی محسوس کرتا جائے اور سوچنے پر مجبور بھی ہو جائے۔ ظرافت کی یہی خوبی انور مسعود کی مذاق و مزاج کی روح رواں ہے، ساتھ ہی تہذیب و معاشرت سے گہری محبت کا احساس ان کی شاعری میں آبِ رواں کی مانند ہے۔ کسی بھی معاشرے کا ایک طاقتور رخ اس کے دیہات کا ماحول ہوتا ہے دیہات کی مٹی سے جڑے لوگ ہمیشہ مٹی سے جڑے رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہی کیفیت انور مسعود کی بھی ہے لیکن نئی تہذیب کے پھندے اب انسانوں کو یوں جکڑے ہوئے ہیں کہ پرانی تہذیب کی تصنع سے پاک، سادہ اور سچی زندگی راس نہیں آ رہی۔ اب خالص دودھ اور دیسی گھی کی حاجت نہیں رہی۔ پرانی اقدار نہیں تو تہذیب بھی ختم ہوئی، معاشرے میں تہذیب ختم تو پھر احساس بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہی بے حسی رشتوں کے تقدس کو پامال کر رہی ہے۔ وہی فرد جو گھر کا ستون سائبان چھت ہوا کرتا تھا جس کے رعب و دبدبے نے تمام رشتوں کو اصولوں، نظم و ضبط اور احترام و تقدس کی ڈوری سے باندھ رکھا تھا، اب اس کی حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے۔

بھینس رکھنے کا تکلف ہم سے ہو سکتا نہیں
ہم نے سوکھے دودھ کا ڈبا جو ہے رکھا ہوا
گھر میں رکھیں غیر محرم ملازم کس لیے
کام کرنے کے لیے ابا جو ہے رکھا ہوا[۲۰]

ذرا سا سونگھ لینے سے بھی انور
طبیعت سخت متلانے لگی ہے
مہذب اس قدر ہو گیا ہوں
کہ دیسی گھی سے بو آنے لگی ہے[۲۱]

تحریف نگاری، طنز و مزاح میں کلیدی صورت اختیار کر چکی ہے۔ بہت سے شعراء نے اسے ایک حربے کے طور پر کامیابی سے برتا ہے۔ انور مسعود نے بھی اسے سماجی برائیوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر نہایت عمدگی سے استعمال کیا ہے اور مشہور و مقبول شعروں اور مصرعوں میں عصر حاضر کے واقعات و مسائل کو نہ صرف برجستگی اور پختگی سے برتا ہے بلکہ اپنی قدرت کلامی اور لفظوں کے موزوں و مناسب استعمال سے صورت حال کے منقش نقش بنائے ہیں۔ خاص طور پر قدیم و جدید تہذیب کے تصادم سے پیدا شدہ حالات، اثرات اور اس کے تقاضوں کے بیان میں آپ نے تحریف نگاری کے اعلیٰ نمونے تخلیق کیے ہیں۔

نئی تہذیب آئی تو نئے فتنے اور نئی سہولتوں کے عذاب بھی ساتھ لائی۔ لوگوں کو آسائشوں کا عادی بنا کر ان کی انفرادی قوتوں کو سلب کر لیا گیا ہے، جدید دور میں برق اور برقی آلات نے جہاں بے شمار آسانیاں فراہم کی ہیں وہیں انسان کو آرام پسند اور سست بھی بنا دیا ہے۔ موسم کی سختیاں بے خطر سہنے والا انسان اب نئی تہذیب میں اتنا نازک مزاج ہو گیا ہے کہ برقی آلات کے بغیر کارِ زندگی کو بالکل ناممکن جانتا ہے۔ بجلی کا آنا جانا زندگی کو متحرک اور مفلوج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ برقی نظام میں ذرا سی بندش یا تعطلی اب حضرت انسان کی آسائش و راحت میں بہت بڑا خلل پیدا کر دیتی ہے جو یقیناً آج کے انسان کا ایک بڑا المیہ ہے۔ انور مسعود نے تحریف نگاری کے ذریعے اس المیہ کو بظاہر دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے:

پنکھے کی دبی نبض چلانے کے لیے آ
کمرے کا بجھا بلب جلانے کے لیے آ
جدائی ہے اگرچہ ترا ملنا
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ[۲۲]

تشبیہات و محاورات کے استعمال سے دلچسپ صورتحال پیدا کرتے ہوئے دل کی اداسی کو بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی سیاہی پر تشبیہ دے کر کہتے ہیں:

کچھ نہ پوچھو اداس ہے کتنا
کتنا سہما ہوا سا رہتا ہے
دل پہ سایہ ہے لوڈشیڈنگ کا
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے[۲۳]

جدید تہذیب نے ضروریات کو بڑھا وا دیا لیکن آدمی کا المیہ دیکھیے کہ آمدن نہ بڑھ سکی؛ لہٰذا ناجائز ذرائع آمدن بھی دخل در معاشرہ ہوئے۔ نفسانفسی کی دوڑ میں خواہشوں کی تکمیل کے لیے جرائم میں بھی اضافہ ہوا۔ ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی دھن، حلال و حرام کے تفرقہ کو بھلا بیٹھی:

یہی اندازِ دیانت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہو گا[۲۴]

عدل کی عمارت ناانصافی کی بنیاد پر کھڑی تھی، سو اس میں محکمۂ پولیس نے بھی خوب ہاتھ رنگے۔ پولیس کی بددیانتی، رشوت خوری اور جرائم کی پشت پناہی نے معاشرتی نظام تباہ کیا تو دوسری طرف ان پر سے بے بس، مجبور عوام کا اعتبار بھی اٹھ گیا۔ ساتھ ہی رشوت خوری کے ناسور کا المیہ بھی معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

آپ بے جرم یقیناً ہیں مگر یہ فدوی
آج اس کام پہ مامور بھی، مجبور بھی ہے
عید کا روز ہے کچھ آپ کو دینا ہوگا
رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے[۲۵]

پولیس جا و بے جا عوام کو تنگ کرتی ہے۔ پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی، ان کا نعرہ ہے لیکن شعار اس کے برعکس ہے۔ اس افسر شاہی اور من مانی پر غالب کی زمین میں انور مسعود لکھتے ہیں:

میں نے کہا کہ آپ نے روک لیا ہے کیوں ہمیں
اس نے کہا تم ایسی بات اپنی زبان پہ لائے کیوں
تم تو ہو صرف آدمی، ہم ہیں پولیس کے آدمی
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی گزر کے جائے کیوں[۲۶]

غالب نے کہا تھا:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو[۲۷]

انور مسعود عصرِ موجود کے بے حس رویوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اس وقت وہاں کون دھواں دیکھنے جائے
اخبار میں پڑھ لیں گے کہاں آگ لگی تھی[۲۸]

محکمانہ غفلت، بے نیازی، کام چوری، رشوت ستانی، ناانصافی ہمارے اداروں کا امتیازی نشان بن چکی ہے، جس کا احساس انور مسعود کے ہاں کافی پختہ صورت میں نظر آتا ہے۔ سرکاری محکمے اور ان کے افسران کسی بھی ملک میں محنت عظمت کی دلیل سمجھے جاتے ہیں لیکن اگر یہی محکمے کام چوری پر کمر کس لیں تو پھر ملک کا سرکاری نظام اپنی صورت آپ میں ایک المیہ بن کر رہ جاتا ہے۔

سرکاری دفاتر میں کسی بھی کام کے لیے پہلا واسطہ کلرک بابو سے پڑنا لازم ہے اور کلرک بابو کی کام چوری، نااہلی اور رشوت خوری دورِ غلامی کی یاد اور سوغات کی طرح آزادی کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے میں چلی آئی ہے۔ ایک طرف غریب بے بس عوام ہیں جو اپنے کاموں کے لیے سرکاری دفتروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں اور دوسری طرف کلرک بابو ہیں

جوان بیچاروں کو چکر دیتے نہیں تھکتے ۔انور مسعود نے اپنے کلام میں متعدد مرتبہ اس صورتِ حال کا تذکرہ بھی نہایت دردمندی سے کیا ہے۔

کلرکوں سے آگے بھی افسر ہیں کتنے
جو بے انتہا صاحبِ غور بھی ہیں
ابھی چند میزوں سے گزری ہے فائل
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں[۲۹]

کلرک کی کام چوری اور بیکاری کی عادت پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے بندۂ مزدور نہ کر اتنی مشقت
کاندھے پہ تھکن لاد کے کیوں شام کو گھر آئے
جا کر کسی دفتر میں تُو صاحب کا ہنر دیکھ
بیکار بھی بیٹھے تو وہ مصروف نظر آئے[۳۰]

اسلام میں شراب کی مانند جھوٹ کو بھی ام الخبائث کہا گیا ہے لیکن ہمارا المیہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جھوٹ ایک اجتماعی خصلت بن چکا ہے۔جھوٹ کی عادت فرد اور معاشرے دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔انور مسعود کو اس حقیقت کا ادراک ہے۔اس المیہ پر طنزیہ چوٹ کرتے ہیں:

یہی تو ہے بڑی خوبی ہماری
کہیں اس ملک میں رشوت نہیں ہے
اور اس سے بڑھ کے ہے اک اور خوبی
کسی کو جھوٹ کی عادت نہیں ہے[۳۱]

معاشرتی روایات واقدار کا جنازہ تو نئی تہذیب نے نکالا ہی ہے اب مہنگائی کی وجہ سے بھی ایک طرف ایسے میزبان ہیں کہ جو مہمان کی آمد کو برکت نہیں زحمت سمجھتے ہیں تو کچھ مہمان ہیں جو مہذب طریق مہمان داری سے بے بہرہ، میزبان کے لیے آزمائش بنے رہتے ہیں:

اس طرح کر رہا ہے حقِ دوستی ادا
اس کا خلوص ہے مجھے حیراں کیے ہوئے
مدت سے ہے اناج کا دشمن بنا ہوا
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے[۳۲]

دوسری طرف بدتہذیبی، بداخلاقی قوم کے مزاج کا حصہ بن چکے ہیں کہ راہ و رسم اور تعلقات رکھنا، مہمان

کی پرسش، مہمان داری سب پستی کا شکار ہیں۔ اخلاقی اقدار کی پستی کو جدید تہذیب کے پس منظر میں یوں بیان کرتے ہیں:

ہزار حیف کہ بجلی چلی گئی ورنہ
جو ہے رواج وہی ہم بھی ہو بہو کرتے
لگا کے ٹیلی ویژن پورے والیوم کے ساتھ
یہ آرزو تھی کہ مہمان سے گفتگو کرتے[۳۳]

سماجی برائیاں انور مسعود کے احاطہ قلم سے باہر نہیں جا سکتیں۔ ان پر تنقید کرکے انور مسعود جیسا حساس دل صرف اور صرف قوم کی اصلاح چاہتا ہے لیکن معاشرے میں عموماً ایسے لوگوں کو پسند نہیں کیا جاتا جو آئینے بیچتے ہوں۔ وہ اس حقیقت سے خود آگاہ و آشنا ہیں اسی تناظر میں کہتے ہیں:

اتنی اچھی بھی نہیں سماجی تنقید
بند ہوجائے نہ انور ترا حقہ پانی[۳۴]

اقدار میں جدت طرازی، ثقافت اور کلچر میں آزاد خیالی، لبرل ازم اور روشن خیالی صرف اغیار کے اوچھے ہتھکنڈے ہیں جن کے ذریعے ہماری نوجوان نسل کو تہذیب کے نام پر بدتہذیب اور ترقی کے پردے میں بے پردگی اور بے حیائی کا درس دیا جارہا ہے۔ انور مسعود جیسے دوراندیش غیر قوم کی چالوں کو یوں بے نقاب کرتے ہیں:

خدا اہلِ ثقافت سے بچائے
کہ باتیں وہ نرالی کہہ رہے ہیں
جسے میں کہہ رہا ہوں بے حیائی
اسے وہ روشن خیالی کہہ رہے ہیں[۳۵]

ایک مفکر کا قول ہے کہ تم مجھے تعلیم یافتہ مائیں دو میں تمھیں تعلیم یافتہ قوم دوں گا، جس طرح اک تعلیم یافتہ ماں قوموں کو ترقی یافتہ بنا دیتی ہے اسی طرح عورت کی روشن خیالی قوموں، نسلوں کو برباد کر دیتی ہے۔ بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے سرنگوں میں بارود بھرنے کی ضرورت نہیں۔ معاشرے میں روشن خیال اور آزادی رائے کے منفی ہتھکنڈوں کے بیج ڈال دیں پھر فتنہ فساد دیکھئے۔ اسی پر انور مسعود لکھتے ہیں:

چھوڑ دینا چاہیے خلوت نشینی کا خیال
وقت بدلا ہے تو ہم کو بھی بدلنا چاہیے
یہ بھی کیا مردوں کی صورت گھر میں ہی بیٹھے رہیں
عورتوں کی طرح باہر بھی نکلنا چاہیے[۳۶]

نئی نسل کی مغرب سے محبت بھی ایک عارضہ جان کی طرح ہے جو ہے مشرقیت کے جسم کا روگ بنتا جا رہا ہے۔ نوجوان نسل کی روشن خیالی اور بڑھتی فیشن پرستی امت کو راہ سے گمراہ کر رہی ہے اس المناک حقیقت کا بیان بڑے موثر انداز میں کرتے ہیں:

طرزِ لباس تازہ ہے اک شکلِ احتجاج
فیشن کے اہتمام سے کیا کچھ عیاں نہیں
یہ لڑکیوں کو شکوہ ہے کیوں لڑکیاں ہیں ہم
لڑکوں کو یہ گلہ ہے وہ کیوں لڑکیاں نہیں[۳۷]

معاشرے میں جب معکوس نظام شروع ہوتا ہے تو حقوق میں بھی توازن نہیں رہتا۔ معاشرے میں جگہ جگہ غیر مساوی تقسیم ڈیرے ڈال لیتی ہے۔ معاشی پگڈنڈیوں پر غریب لڑکھڑاتا ہے، گرتا ہے لیکن امیر حاکم بن کر مذاق اڑاتا ہے انور مسعود کا قلم اس سماجی ناانصافی سے ناآشنا نہیں۔

کل قصائی سے کہا اک مفلس بیمار نے
آدھ پاؤ گوشت دیجئے مجھ کو یخنی کے لیے
گھور کر دیکھا اسے قصاب نے کچھ اس طرح
جیسے اس نے چھیچھڑے مانگے ہوں بلی کے لیے[۳۸]

انور مسعود محنت کی عظمت کے قائل ہیں، اسی لیے نوجوانوں کو محنت اور جہدِ مسلسل کا درس دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوجوانوں کی سستی معاشی بدحالی کی نشانی ہے اور اگر کوئی مہنگائی کا رونا روئے تو اصل میں اسے اپنی کاہلی اور کام چوری اور کھیل تماشوں پر رونا چاہیے آج کے جوانوں کا المیہ بیان یوں کرتے ہیں:

جو کہتے ہیں کہ مہنگے ہو گئے ہیں
مٹن اور دال اور آٹا وغیرہ
ذرا ان کے مشاغل بھی تو دیکھو
پتنگیں، ڈور، بو کاٹا وغیرہ[۳۹]

کسی بھی قوم کے ذوق اور تہذیب کا ایک معیار اس کے فنون لطیفہ کے تئیں صحت مند اور ترقی یافتہ نظریہ بھی ہے۔ آرٹ، موسیقی، فنونِ لطیفہ ہماری ثقافت کا حصہ ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے متعلق انور مسعود کا شعور قابلِ تعریف ہے۔ انور مسعود اپنے معاشرے میں ثقافت کی تنزلی پر فکرمند ہیں۔ وہ بغیر سر تال کی موسیقی سے نالاں ہیں۔ موسیقی جواب صرف جھومنے اور بے ہنگم چیخ پکار بن کر رہ گئی ہے اس پستی کا شکار صنف موسیقی کی انور مسعود ایسے دلچسپ الفاظ میں تصویر کشی کرتے ہیں کہ مزاح بھی اپنا رنگ دکھاتا ہے اور طنز بھی دعوت فکر دیتا ہے:

کوئی سنگر جس طرح اپنا ہلاتا ہے بدن
آپ بھی اپنا بدن ویسے ہلاتے جائیے
قوم کو کیسا تھرکتا مشغلہ سونپا گیا
گیت گاتے جائیے تالی بجاتے جائیے[۴۰]

انور مسعود میں عصری شعور و ادراک ان کے کلام میں حالاتِ حاضرہ پر تبصروں کی صورت جا بجا نظر آتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر آپ کے قطعات ملکی روز ناموں میں سال ہا سال سے شائع ہو رہے ہیں۔ جو ایک طرف اردو طنز و مزاح کے میدان میں ان کی کاملیت و مقبولیت کا ایک ثبوت ہیں تو دوسری طرف ملکی اور بین الاقوامی معاملات، سیاست، جمہوریت پر آپ کی گہری نظر کے غماز ہیں۔ ملکی معاملات کو دیکھیں تو آپ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ فرقہ بندی، تفرقہ، نفاق سب نے مل کر معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ معاشرے میں دین دار تو بہت ہیں لیکن ایک دین نہیں ہے۔ اسی نفاق اور تفرقہ کا نتیجہ ہے کہ ہمارا ملک ابھی تک چاند عید کی شہادتوں کے تقاضوں پر متفق نہ ہو سکا اور پاکستان جیسے ملک میں بعض اوقات چار چار عیدیں ہوئیں۔ اس میں کچھ تعلق تو طاغوتی قوتوں کا نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی آستین میں چھپے سانپوں کا خدشہ بھی موجود رہتا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے ہم کہ اب تک دنیاوی ترقی میں اسقدر سست رفتار ہیں کہ چاند کی شہادت تک کا مسئلہ حل نہ کر سکے اور دوسری طرف غیر قوم چاند کو فتح کر کے اب مریخ پر جانے کی جستجو میں ہے۔

چاند کو ہاتھ لگا آتے ہیں اہلِ ہمت
ان کو یہ دھن ہے کہ اب جانبِ مریخ بڑھیں
ایک ہم ہیں کہ دکھائی نہ دیا چاند ہمیں
ہم اسی سوچ میں ہیں عید پڑھیں یا نہ پڑھیں[۴۱]

عصرِ حاضر کے نئے فتنوں میں جہاں مسلمانوں کا وجود دیگر اقوام کے لیے نا قابلِ قبول ہے۔ وہ کبھی جنگ، کبھی اقتصادی ترقیوں اور کبھی جبری قبضوں سے مسلمانوں کو ختم کر رہی ہیں اسی طرح کچھ پڑھے لکھے حربے بہبودِ آبادی کے تناظر میں خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے بھی جاری ہیں۔ انور مسعود ایک رمز شناس کی طرح اس سازش سے آشنا ہیں اور ادبی و فنی محاسن مثلاً واقعہ نگاری اور تضمین کے حسین امتزاج سے وہ عالمی طاقتوں کے ہتھکنڈوں کا پردہ یوں فاش کرتے ہیں:

شعبہ ضبطِ ولادت کا یہ مقصد ہے فقط
دل گرفتہ، غمزدہ، آزردہ جاں کوئی نہ ہو
''پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار''
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو[۴۲]

کل اک بچوں کی مجلس میں کہا اک شوخ بچے نے
ہماری تاک میں دشمن بڑے ہوشیار بیٹھے ہیں
عزیزو، ساتھیو! منصوبہ بندی کے زمانے میں
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں[۴۳]

عہدِ حاضر کے دیرینہ مسائل میں سے ایک مسئلہ صحت کا بھی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں صحت، تعلیم خوراک کا فقدان تو ایک المیہ بن ہی چکے ہیں، لہٰذا بنیادی ضرورتوں میں صحت کا مسئلہ اب آخری درجوں میں جگہ پانے لگا ہے۔ مادی ضروریات سے نبرد آزما ہوتا انسان جب بیمار ہو کر مجبوراً کسی حکیم، طبیب یا ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو پھر مسیحا بن کر لوٹنے والا اپنی فیس کے ساتھ اپنی ڈسپنسری سے دوائیوں کی فروخت کے لیے ایک لمبا نسخہ تجویز کرتا ہے۔ جس کا حاصلِ مقصد مریض کی صحت نہیں بلکہ ڈاکٹر کی ذاتی دولت میں اضافہ ہوتا ہے، اسی المیے کا ادراک کرتے ہوئے بصورت قصہ ڈاکٹر کے مکر و فریب کا حال دلچسپ صورت میں بیان کرنا انور مسعود کا ہی کمال ہے۔

اک ڈاکٹر سے مشورہ لینے کو میں گیا
ناسازیِ مزاج کی کچھ ابتداء کے بعد
کرنے لگے وہ پھر مرا طبی معائنہ
اک وقفہ خموشی صبر آزما کے بعد
ضرباتِ قلب و نبض کا جب کر چکے شمار
بولے اپنے پیڈ پہ کچھ لکھ لکھا کے بعد
ہے آپ کو جو عارضہ وہ عارضی نہیں
سمجھا ہوں میں تفکر بے انتہا کے بعد
لکھا ہے اک نسخہ اکسیر و بے بدل
لیجئے نمازِ فجر سے پہلے یہ کیپسول

کھائیں یہ گولیاں بھی نمازِ عشاء کے بعد
سیرپ کی اک ڈوز بھی لیجئے گا نہار منہ[۴۴] الخ

ان کی نظم ''سائیڈ افیکٹس'' بھی طبیب کی مریض کو انتباہ کی ایک پیار بھری دھمکی کی ایک صورت ہے۔

پاکستان کو اندرونی سازشوں کا اول دن سے ہی سامنا تھا۔ اغیار کی نظر نے کبھی پاکستان کو آزاد ریاست کے طور پر قبول نہ کیا ان کی سازشوں کے نتیجے میں کئی جنگیں پاکستان کا مقدر بنیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں فتح نے دشمنوں کی نیند چھ

سال تک اڑائے رکھیں اور آخرکار اسباب اندرونی بیرونی کے سبب پاکستان نے تاریخ کا المیہ و سانحہ دیکھا اور مشرقی پاکستان الگ ہوگیا۔اس سانحے پر انور مسعود غمگین صورت اس بات پر تو حیران و پریشان ہیں کہ وطنِ عزیز کا ایک بازو کٹ کر جدا ہوا لیکن کربناک صورتحال اس سے زیادہ شرمناک ہے کہ ہم وطنوں میں اس سانحے پر احساسِ ندامت تک نہ تھی۔

کس طرح کا احساسِ زیاں ہے جو ہوا گم
کس طرح کا احساسِ زیاں ہے جو بچا ہے
ملک آدھا گیا ہاتھ سے اور چپ سی لگی ہے
اک لونگ گواچا ہے تو کیا شور مچا ہے[۴۵]

انور مسعود کی شاعری میں ایک طرف پاکستان بننے کے بعد ان ادھورے خوابوں کا المیہ ہے جو ہمارے بزرگوں نے دیکھے تھے اور دوسری طرف معاشرے میں اخلاقی اقدار و روایات کی تنزلی کے زخم ہیں جو ہم وطنوں کی بے حسی اور بے نیازی نے لگائے ہیں۔ جتنے زخم وطن عزیز کے سینے پر ہیں، ان سب پر حساس دل انور مسعود نوحہ کناں ہیں۔وطن عزیز کے انھیں درد اور داغوں میں سے ایک دکھ جو ہمارے ہم وطنوں کا مشترکہ المیہ بنتا جا رہا ہے وہ ہے اپنے آزاد وطن میں اپنی قومی زبان اردو کے سرکاری سطح پر نافذ نہ ہونے کا دکھ۔تاریخِ پاکستان گواہ ہے کہ آزاد وطن کے حصول کی جدوجہد کرنے والے جانباز دلوں کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ آزاد وطن کی فضاؤں میں جب ہم وطنوں کی آوازیں گونجیں تو ان میں سے فرنگیت کی نہیں بلکہ مشرقیت اور اپنائیت کی مہک آئے لیکن افسوس کہ دیگر بہت سے خوابوں کی طرح تاحال یہ خواب بھی اپنی تعبیر کا منتظر ہے۔انور مسعود کا مشرقیت سے عشق اُنھیں اردو کے نفاذ کی کوشش کے لیے پیکارِ عمل رکھے ہوئے ہے اور اس شعوری کوشش کی ترجمان ان کی شاعری ہے۔

میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
مجھ سے وطن کی طرزِ بیان چھین لی گئی

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میں وہ ہوں جس سے اُس کی زباں چھین لی گئی[۴۶]

غیروں کے نہیں اپنے معاشرے، ہی معاشرے میں اردو کی ناقدری پر آپ کا دل گریہ زار ہے:

ہر شخص کو زبانِ فرنگی کے باٹ سے
جو شخص تولتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

افسر کو آج تک یہ خبر ہی نہیں ہوئی
اردو جو بولتا ہے سو بھی آدمی[۴۷]

ایک سچے مصلح اور طنز نگار کی طرح ملکی معاملات پر ہی نہیں عالمی واقعات، حادثات، سانحات پر بھی آپ قطعات میں ایک نڈر، بے باک صحافی اور تجزیہ نگار کی طرح سیخ پا ہوتے ہیں اور ایک حساس شاعر کی طرح دکھ والم کا اظہار بھی دردمندی سے کرتے ہیں۔

بات ہے انصاف کی اور ہم کہیں گے بار بار
چاہے امریکہ بہادر کو بہت مندی لگے
جس نے ایٹم بم گرائے کشورِ جاپان پر
کیوں نہ آخر سب سے پہلے اس پہ پابندی لگے[۴۸]

مشکل خشک سنگلاخ زمین میں طنز ومزاح کی پھلجھڑیاں کھلانا آسان نہیں لیکن انور مسعود نے اس میں بھی اپنی حسِ لطافت ونظر دور بیں سے غنچے کے غنچے کھلا دیے ہیں۔ انور مسعود نے جہاں طنزیہ وفکاہیہ ادب میں موضوعات میں جدت طرازی کی نئی مثالیں قائم کی ہیں، وہیں ماحولیات پر ''میلی میلی دھوپ'' کے عنوان سے ایک انوکھا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> اس وقت دنیا کو جو زبردست چیلنج درپیش ہیں ان میں ماحول کے تحفظ کا مسئلہ سرِفہرست ہے۔ قدرتی ماحول کی آلودگی، عدم نظامت اور بے ہنگم شور نے انسان کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ شجر کنی کی رفتار شجر کاری سے کہیں زیادہ ہے۔ نتیجتاً سارا ماحول دشمن جاں بنتا جارہا ہے اور نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کو بڑے خطرات لاحق ہیں ماحول کا توازن اس طرح برباد ہوا ہے کہ اب ملکوں ملکوں اس آشوب کثافت سے نجات پانے کی تدبیریں سوچی جارہی ہیں اس لیے کہ صفائی اور صحت، ہریالی اور خوشحالی کی طرح لازم وملزوم ہیں۔[۴۹]

انور مسعود کا کمال ہے کہ ماحولیات جیسے خشک صحرا میں ظرافت کا نخلستان کھلا دیا۔ انھوں نے نہ صرف عصری شعور کے تحت ماحولیات سے متعلق آگاہی وشعور فراہم کیا بلکہ ادبی تقاضے بھی بھرپور انداز میں پورے کیے۔ مفکرین کے اقوال، سائنسی نظریات کو غزل، نظم اور قطعہ جیسی اصناف کے پیرائے میں مقصدیت اور مزاح کے حسین امتزاج کی صورت شوخی و شرارت لیکن متانت وصداقت کے پیرائے میں بیان کرنا انور مسعود کے فکر وفن کی بلندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

آنے والی نسلوں کے لیے ہم ترکہ میں آلودہ ماحول اور پراگندہ فضائیں چھوڑ کر جارہے ہیں۔ اس المیاتی صورتحال پر احساسِ زیاں کا احساس دلاتے نوحہ کناں ہیں:

تبصرے ہوں گے مرے عہد پہ کیسے کیسے
ایک مخلوق تھی میراثِ رواں چھوڑ گئی
پھونکتی رہتی تھی پٹرول بھی تمباکو بھی
ہائے کیا نسل تھی دنیا میں دھواں چھوڑ گئی[۵۰]

انور مسعود انسان کی عاقبت نااندیشی پر بھی دکھی ہیں کہ انسان اپنی بے حسی کی عادت میں اس قدر آگے نکل چکا ہے کہ اُسے خبر نہیں کہ وہ نادانی میں جس شاخ پہ بیٹھا ہے اُسی کو کاٹ رہا ہے اور زمین کو آلودہ کرنے کے بعد اب پانی جیسی نایاب نعمت کو بھی اپنے ہاتھوں سے ضائع و برباد کر رہا ہے۔

حضرتِ انساں ہوں میں اور ہوں بہت جدت پسند
نو بہ نو تازہ بہ تازہ تجربے میرا ہدف
خشکیوں پر میں بہت پھیلا چکا آلودگی
اب میری ساری توجہ ہے سمندر کی طرف[۵۱]

کرۂ ارض پر بسنے والی تمام مخلوقات کے لیے پانی ایک نعمتِ نایاب ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ حیرت ہے کہ انسان اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہوئے بھی اس نعمت کے بے دریغ استعمال اور اس کو آلودہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ انور مسعود انسان کو ایک آہ کی صورت اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پانی کی آلودگی نہ صرف انسان لے لیے خطرناک اور المناک ثابت ہو سکتی ہے بلکہ پانی میں بسنے والی مخلوقات کے لیے بھی جان لیوا ہے۔

اک گریہ سنائی دیتا ہے
سارے دریاؤں کی روانی میں
آدمی نے وہ زہر گھولا ہے
مچھلیاں مر رہی ہیں پانی میں[۵۲]

انور مسعود ایک مصلح اور سچے رہبر و رہنما کی طرح انسان کو احساس دلاتے ہیں کہ اس کے اس دنیا میں چین و سکون سے رہنے کے لیے صحت مند ہونا لازمی ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ کفرانِ نعمت کی بجائے شکرانِ نعمت کی عادت اپنائے اور جن چیزوں کو قدرت نے اس کے آرام و سکون کے لیے پیدا کیا ہے ان کی قدر کرے۔ اسی تناظر میں درختوں کی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فصلِ گرما میں جو ہوتی ہے مسافت درپیش
سر پہ جب دھوپ کی چادر سی تنی ہوتی ہے

راہ پہ پیڑ محبت سے بلاتے ہیں مجھے
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے[۵۳]

انور مسعود کی شاعری انسان سے محبت کی شاعری ہے اس لیے جس چیز سے بھی انسان کے پریشان اور دکھی ہونے کا شائبہ ہو وہ انسان کو اس سے خبر دار کرنا اپنا منصب اور فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی انسان کی زندگی اور صحت کے لیے آج کے دور کا سب سے بڑا خطرہ ہے اور اگر اب بھی ہوش کے ناخن نہ لیے گئے تو یقیناً ایک بیمار اور پریشان زندگی ہی مقدر ہوگی جو نہ صرف معاشرے پر بلکہ بذاتِ خود فرد کے لیے بھی ایک سزا ہی بن کر رہ جائے گی۔ انور مسعود اسی کسمپرسی کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

بہت تنگ کرنے لگی ہے کھانسی
کچھ ایسی ہے بلند آہنگ کھانسی
بہت نزلے کی ہے ریشہ دوانی
بہت بہنے لگا آنکھوں سے پانی
ہر سو اک دھندلکا چھا رہا ہے
دھواں اپنا اثر دکھلا رہا ہے[۵۴]

وہ تنبیہ کرتے ہوئے نہایت ہمدردی سے کہتے ہیں:

تیرا اپنا ہی کیا آیا ہے تیرے سامنے
تو اگر بیمار پڑ جائے واویلا نہ کر

میں بتاتا ہوں تجھے صحت کا بنیادی اصول
جس ہوا میں سانس لیتا ہے اسے میلا نہ کر[۵۵]

قمریوں کے غم میں آپ بھی انسان کی بے رحمی پر دکھی نظر آتے ہیں آزاد نظم میں اس کا اظہار بھی وقت کے المناک المیہ کی صورت کرتے ہیں:

قمریاں خاموش و بے پرواز و پیہم دم بخود
ان کے نورستہ پروں میں
کیا حسین ارمان تھے

جو فقط اشکوں میں ڈھل کر رہ گئے

اب کہیں ان کو نظر آتے نہیں

وہ شجر

جو ان کی جند اور جان تھے

جن کی شاخیں

سر پٹکتی رہ گئیں

جن کے پتے

ہاتھ مل کر رہ گئے

کیا صنوبر تھے کہ جو چولہوں میں جل کر رہ گئے [۵۶]

غرض انور مسعود کی شاعری اپنے اندر موضوعات، خیالات اور فنی و فکری محاسین کا ایک بحر بیکراں سموئے ہوئے ہے جو انسان اور انسانیت سے محبت سکھاتی ہے، جو آدم کو مقام آدمیت سے روشناس کرواتی ہے اور جس میں زندگی کی تمام تر شوخی، شرارت اور رنگینی جھلکتی ہے۔ ایک طرف آپ کا کلام انسانوں کے دکھ، درد اور المیوں کی داستان بیان کرتا ہے تو دوسری طرف حالات کے بدل جانے کی آس نوید بھی سناتا ہے۔ انور مسعود کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری فکاہی ادب کا ایسا سرچشمۂ ناز ہے جن سے آنے والے علم وفن کے پیاسے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ انور مسعود، درپیش، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۷

۲۔ انور مسعود، اک دریچہ، اک چراغ، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۶۵

۳۔ ایضا ۴۲

۴۔ انور مسعود، درپیش، ص نمبر ۳۳

۵۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، فلیپ: درپیش، انور مسعود، ص بیک پیج

۶۔ انور مسعود، غنچہ پھر لگا کھلنے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۴۵

۷۔ مشتاق احمد یوسفی، ''سادگی و پرکاری''، مشمولہ: غنچہ پھر لگا کھلنے، انور مسعود، ص ۱۶

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور، کتب خانہ اکیڈمی، (اشاعت اوّل)، ۱۹۵۸ء، ص ۴۶

۹۔ انور مسعود سے ایک مکالمہ، گفتگو، اوجِ کمال، کراچی، دنیائے ادب، اگست ۲۰۰۶ء ص ۳۵

۱۰۔ انور مسعود، قطعہ کلامی ،اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۵۳
۱۱۔ انور مسعود، غنچہ پھر لگا کھلنے ،ص ۵۵،۵٦
۱۲۔ انور مسعود، درپیش ،ص ۵۴
۱۳۔ انور مسعود، غنچہ پھر لگا کھلنے ،ص ۴۷
۱۴۔ انور مسعود، قطعہ کلامی ،ص ۳۴
۱۵۔ انور مسعود، غنچہ پھر لگا کھلنے، ص ۸۱،۸۲
۱٦۔ مشتاق احمد یوسفی، ''مقدمہ چراغ تلے'' مشمولہ: مجموعہ مشتاق احمد یوسفی ،مشتاق احمد یوسفی، لاہور، جہانگیر سنز، سن ندارد، ص ۱۴
۱۷۔ مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی ،گورکھپور، ایوان اشاعت، ۱۹۳۹ء، ص ۲
۱۸۔ انور مسعود، شاخِ تبسم ،اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۲۸۲
۱۹۔ انور مسعود، درپیش، ص ۱۱۸
۲۰۔ انور مسعود، قطعہ کلامی ،ص ۱۸
۲۱۔ ایضا، ص ۱۹
۲۲۔ ایضا ص ۸۰
۲۳۔ ایضا ص ۱۵۵
۲۴۔ انور مسعود، اک دریچہ، اک چراغ، ص ۲٦
۲۵۔ ایضا، ص ۱۳۷
۲٦۔ انور مسعود، غنچہ پھر لگا کھلنے ص ۲۵
۲۷۔ مرزا غالب، دیوان غالب، مرتب؛ وحید الرحمٰن، ڈاکٹر، نئی دہلی، غالب اکیڈمی، سن ن، ص ۱۰۵
۲۸۔ انور مسعود، اک دریچہ، اک چراغ، اسلام آباد، دوست پبلیکیشنز، ۲۰۰۸، ص ۴٦
۲۹۔ انور مسعود،، قطعہ کلامی ،ص ۱۱۴
۳۰۔ ایضا، ص ۸۷
۳۱۔ ایضا، ص ۴٦
۳۲۔ ایضا، ص ۵٦
۳۳۔ انور مسعود، درپیش، ص ۷۵
۳۴۔ ایضا، ص ۸۴
۳۵۔ ایضا، ص ٦۷
۳٦۔ انور مسعود، قطعہ کلامی ،ص ۱۰۱
۳۷۔ ایضا، ص ۱۰۹

۳۸۔ ایضا، ص۱۰۷

۳۹۔ انورمسعود، درپیش ،ص۸۹

۴۰۔ ایضا، ص۱۰۴

۴۱۔ انورمسعود،قطعہ کلامی ،ص۲۳

۴۲۔ ایضا، ص۱۷

۴۳۔ ایضا، ص۹۲

۴۴۔ انورمسعود،درپیش ،ص۱۷،۱۸

۴۵۔ انورمسعود،غنچہ پھر لگا کھلنے ،ص۲۳

۴۶۔ انورمسعود،قطعہ کلامی ،ص۱۵۱

۴۷۔ ایضا، ص۱۳۶

۴۸۔ انورمسعود،درپیش ،ص۲۵

۴۹۔ انورمسعود،''دیباچہ میلی میلی دھوپ''،مشمولہ:میلی میلی دھوپ،انورمسعود،اسلام آباد،دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء،ص۱۱

۵۰۔ ایضا، ص۲۴

۵۱۔ ایضا، ص۴۰

۵۲۔ ایضا، ص۴۶

۵۳۔ ایضا، ص ۵۷

۵۴۔ ایضا، ص ۱۲۶

۵۵۔ ایضا، ص ۷۲

۵۶۔ ایضا، ص۱۱۲